بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرّم مُراد

پاکستان میں سیاسی محاذ آرائی روز بروز شدید ہوتی جا رہی ہے۔ ایک عام آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ بحران کی یہ صورت حال زیادہ عرصہ اس طرح نہیں چل سکتی۔ ملک تباہ و برباد ہو رہا ہے' اور اگرچہ ۱۹۷۱ء کی طرح ختم نہ ہو' پھر بھی غالب امکان یہی ہے کہ کوئی ایسا "غیر معمولی" اقدام کیا جائے' جس طرح ماضی میں برابر کیا جاتا رہا ہے' جو بظاہر بحران کو ختم کر دے لیکن فی الحقیقت ایک اور سنگین تر بحران کی بنیاد رکھ دے۔ بالکل ممکن ہے کہ "معین قریشی" ٹائپ حکومت اب زیادہ عرصہ کے لیے مُسلط کر دی جائے۔ کسی تحریک کا چلنا بہت دشوار ہے اور اگر چل بھی جائے تو مقتدر قوتوں کی حمایت کے بغیر فریقِ مخالف کو اقتدار واپس نہیں دلا سکے گی۔

جو بات ہر عام آدمی کو نظر آ رہی ہے' وہ برسرِپیکار فریقین کو کیوں نظر نہیں آ رہی' یا ہوسِ اقتدار نے ان کو اندھا کر رکھا ہے؟ ایک فریق کی رَوش تو کسی طرح سمجھ میں آتی بھی ہے۔ جب ہم اقتدار میں نہ رہے اور وزارتِ عظمٰی ہم سے چھن گئی تو' کچھ بھی پیش آ جائے' لیکن دوسرا فریق ملک نہ چلانے پائے اور وہ بھی اقتدار سے محروم ہو۔ پھر جس انداز میں جمی جمائی مسندِ اقتدار ان کے نیچے سے کھسکا دی گئی تھی' اس کا داغ بھی تڑپاتا ہو گا' یہ بھول کر کہ وہ خود کس طرح اقتدار پر قابض ہوئے تھے' اور کورٹ کے فیصلہ کے بعد انھوں نے پنجاب میں کیا حماقتیں کی تھیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ذرا بھی مفاہمت کی رَوش اختیار کی' تو جو فریق برسرِاقتدار ہے اس کی کرسی اور مضبوط ہو گی۔ ملک پر جو بھی گزرے' پھر وہ اس "گناہ" کا ارتکاب کیوں کریں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ بھاڑ میں جائے ایسی جمہوریت' بھاڑ میں جائے ایسا آئینی حق۔

لیکن جس فریق نے گذشتہ سال کی اکھاڑ پچھاڑ کے نتیجہ میں اقتدار سنبھالا ہے' اس کی روش

تو بالکل ناقابل فہم ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ خود کو جلد از جلد اقتدار سے بے دخل کرنے کا مشن لے کر برسراقتدار آئے ہیں۔ نہ حکومت کی کوئی سمت ہے' نہ واضح اہداف' نہ ملک کے پیچیدہ مسائل کا سوچا سمجھا حل۔ بین الاقوامی فورم میں کشمیر کا مسئلہ جس موثر انداز میں پیش کیا گیا اس کا اعتراف نہ کرنا بخل ہو گا' لیکن فوراً ہی بعد سکھوں کے مقابلہ میں راجیو گاندھی کی مدد کے اعتراف' اور اب اقوام متحدہ میں کشمیر قرارداد کی واپسی نے سب کیا دھرا برابر کر دیا۔ ابھی وقت تھوڑا گزرا ہے' اس لیے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سرحد میں جو کارروائی وہ کر رہے ہیں وہ اسی طرح ان کے اقتدار کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہو گی جس طرح گذشتہ حکومت کی پنجاب میں کارروائی ان کے لیے ہوئی' لیکن یہ بالآخر ان کے اقتدار کے خاتمے میں اہم حصہ ادا کرے گی۔ ماں سے جنگ بھی جاری ہے۔ جب اتنے محاذ کھلے ہوئے ہوں تو ملک کے انتہائی پیچیدہ مسائل حل کرنے کی فرصت کہاں سے ملے۔

کسی مفاہمت اور تعاون کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' تحمل و رواداری بھی دور کی بات ہے' جو زبان استعمال ہو رہی ہے اسے دیکھیے تو سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ کشت و خون کی دھمکیاں ہیں' کھلی کھلی گالیاں ہیں' "ہم بدمعاش ہیں" کے نعرے ہیں۔ افغانستان میں خانہ جنگی کی مذمت بجا' لیکن پاکستان کے باہم دست بگریباں لیڈروں کے پاس بھی' الفاظ کے بجائے' کلاشنکوف' راکٹ اور ہوائی جہاز ہوتے' اور اپنے ارمان پورے کرنے کے لیے اسمبلیوں اور پریس کے بجائے میدان' تو ہمیں یقین ہے کہ وہاں سے بدتر خون ریزی یہاں ہوتی' اور شاید لوگ ایک دوسرے کو کچا ہی چبا جاتے۔

نظام کی بقا اداروں کے استحکام پر منحصر ہے۔ جن کا اقتدار اداروں کے تحفظ کے ساتھ وابستہ ہے وہ بھی ان کو غیر مستحکم کرنے میں مصروف ہیں' جو اقتدار چھینے جانے پر تلملا رہے ہیں وہ تو ان کو تباہ کرنے پر تلے ہی ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسمبلیاں قانون سازی کے بجائے جنگ و جدل کے اکھاڑے بن گئی ہیں۔ بیورو کریٹ کہیں بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں' کہیں بے یقینی کے عالم میں ادھر سے اُدھر لڑھکائے جا رہے ہیں۔ جو فریق عدالتوں میں ہارتا ہے' وہ ان کو برا بھلا کہنے پر اتر آتا ہے۔

یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ دونوں گروہوں نے اپنے اقتدار اور قوم کے مفاد کو ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ پانچ سال کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اب کوئی فریق دوسرے کو کسی قیمت پر حکومت نہیں کرنے دے گا۔ لیکن کوئی دوسرے کو فی الحال مٹا بھی نہیں سکتا۔ پھر انجام کیا ہو گا؟ یہ سوال ہر دردمند

پاکستانی کو پریشان کر رہا ہے۔

ویسے غور کیجیے تو ہمارا پاکستان مختلف پہلوؤں سے ایک خوش قسمت ملک ہے۔ قدرتِ الٰہی نے اسے بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ ہمارے لوگ توانا و جفاکش' جذبوں سے معمور اور بہترین انسانی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ کیا کام ہے جو وہ نہیں کر سکتے: جو پھل کبھی نہ ہوئے ان کے لہلہاتے باغ انھوں نے لگا دیے' ایٹم بم انھوں نے بنا لیا۔ ہماری دھرتی' سونا اگلنے والے کھیتوں' وافر پانی' اور پٹرول و گیس سمیت ہر نوع کے قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ وسط ایشیا' مشرق وسطیٰ اور مشرقی ایشیا کے درمیان واقع' ہم ایک اہم اور منفرد اسٹرٹیجک مقام کے حامل ہیں۔ خود ملک کا وجود انسانی جذبوں اور قربانیوں اور خدائی عطا و بخشش کے توافق کا نتیجہ ہے' ورنہ دَورِ جدید کے تہذیبی نقشہ پر پاکستان جیسے نظریاتی ملک کی گنجائش کہاں نکل سکتی تھی۔

مگر بدنصیبی اس کی یہ ہے کہ نصف صدی ہو گئی ہے' آج تک اسے وہ لیڈر میسر نہیں آئے جو پاکستان کو بلدۂ طیبہ بناتے۔ اس کے برعکس' جس جس کے ہاتھوں زمامِ کار آئی' اس نے پاکستان کے قیمتی انسانی وسائل بے دردی کے ساتھ ضائع کیے' جوانوں کی جوانی' بوڑھوں کی فرزانگی' اہلِ علم کی دانش' محنت کاروں کی محنت' سب رائیگاں جاتی رہی۔ جو قدرتی وسائل موجود تھے وہ بھی ان کی غفلت کی نذر ہو گئے۔ کھیتوں کی پیداوار کم ہوتی گئی' پانی کی فراہمی گھٹتی گئی۔ جو نئے وسائل وجود میں آئے' ان کو انھوں نے دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور ان پر داد عیش دینے میں مصروف رہے۔

لیڈروں سے ہماری مراد ہر شعبہ زندگی کے لیڈروں سے ہے' لیکن ان میں سیاسی لیڈر' جنرل اور بیوروکریٹ یقیناً سرِفہرست ہیں۔ یہ پاکستان کو بنانے والے ہوں یا بعد میں آنے والے۔ یہ سکندر مرزا' ایوب خاں' بھٹو اور بے نظیر ہوں' یا ضیاء الحق اور نواز شریف۔ اور اگر یہ بات تسلیم کی جائے کہ لوگوں کو ویسے ہی لیڈر ملا کرتے ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں--- دودھ زہریلا ہو تو اوپر مکھن بھی زہریلا ہو گا--- تو عام لوگ بھی سارا الزام لیڈروں کے سر رکھ کے خود بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً سلطانی جمہور کے اس دَور میں' جب وہ خود انھی لیڈروں کو اپنا ہیرو بناتے ہیں' اور ان ہی کو ووٹ دینے کے لیے بیلٹ بکس تک چل کر جاتے ہیں۔

انھی لیڈروں کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے کہ آج اُمت میں افتراق و انتشار کا بدترین نمونہ دیکھنا ہو تو اپنے پاکستان کو دیکھ لیجیے۔ وعدہ الٰہی--- وہ تمھیں گروہ گروہ کر کے ایک دوسرے سے لڑنے کا مزہ چکھا دے گا--- کا ظہور' سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہو تو پاکستان پر نظر ڈال لیجیے۔

۲۵ سال پورے نہ ہوئے تھے کہ ملک دو ٹکڑے ہو گیا' اب مزید ۲۵ سال گزرنے کے بعد ہم پھر اسی مقام پر کھڑے ہیں۔ دوسری مارشل لائی حکومت کا آکسیجن ماسک جب سے اترا ہے' قوم مسلسل ایک کے بعد دوسرے بحران کا شکار ہے۔ پانچ سال میں تین الیکشن ہو چکے ہیں' لیکن سیاسی استحکام کا دُور دُور پتا نہیں۔ چنانچہ ملک کی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی ہے' اور اس کا تختہ تختہ ہل رہا ہے۔

ان لیڈروں نے ملک کو صرف شکست و ریخت' سیاسی محاذ آرائی اور عدم استحکام کے "تحائف" ہی نہیں دیے ہیں' بلکہ جس شعبہ زندگی کو لیجیے اس میں بگاڑ اور انحطاط ہی پیدا کیا ہے۔ ملک چلانے میں ان کی کارکردگی انتہائی گھٹیا اور ناقص رہی ہے۔

ان کے ایجنڈے پر سرفہرست معاشی ترقی رہی ہے۔ اس کو سرفہرست ہونا چاہیے تھا یا نہیں' یہ الگ بحث ہے۔ لیکن آج معاشی ترقی کا یہ عالم ہے کہ عام آدمی کی کمر گرانی کے بوجھ سے ٹوٹی جا رہی ہے' بیروزگار مارے مارے پھر رہے ہیں' بیرونی تجارت کا میزانیہ خسارہ میں ہے' قوم کا بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے' تقریباً آدھا بجٹ ان کی ادائیگی کی نذر ہو جاتا ہے' سڑکیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں' نہریں خستہ حالت میں ہیں اور ان میں آب رسانی کی صلاحیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ چند لوگوں کے پاس پیسہ ہے' مگر حکومت کا خزانہ مفلس ہے۔ لوڈشیڈنگ سے اربوں روپے کی پیداوار کا نقصان ہوتا ہے' مگر کسی حکومت نے ایسے موثر اقدامات نہیں کیے کہ اس بربادی سے نجات کا سامان ہو جاتا۔

پاکستان جب بنا تو وہ خوراک میں خود کفیل تھا۔ ہمارے پڑوس میں' بھارت کا صوبہ پنجاب' اب بھی اپنے سارے ملک کو غلّہ فراہم کر رہا ہے۔ مگر ہم عرصہ سے دانہ دانہ کے لیے باہر کے محتاج ہیں' اور اس ہی کی خاطر ان کے دام میں گرفتار بھی۔ کسان ہماری آبادی کا ۹۰ فی صد تھے' ان کی فلاح و بہبود کے لیے ان لیڈروں نے کچھ نہیں کیا۔ ان کے پاس نہ تعلیم ہے نہ علاج' نہ بجلی نہ پینے کے لیے صاف پانی' نہ سڑکیں نہ انسانوں کے رہنے کے لائق مکان۔

پاکستان کی سالمیت کی خاطر دین کی خاطر' اخلاق و کردار کی تعمیر کی خاطر' تعلیم پر کماحقہٗ توجہ دینے کی بات جانے دیجیے! سب جانتے ہیں کہ معاشی ترقی بھی تعلیم میں ترقی کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن تائیوان اور کوریا سے ہم کیا مقابلہ کریں' ہندوستان' چین اور انڈونیشیا جیسے ممالک سے بھی ہم کوسوں پیچھے ہیں۔ پرائمری اور سیکنڈری میں داخلہ کی شرح انڈونیشیا میں ۸۱ فی صد ہے' ہندوستان میں ۶۸ فی صد ہے' مگر پاکستان میں صرف ۲۹ فی صد ہے۔ ان پرائمری اسکولوں میں سے

بھی ایک بڑی تعداد چھتوں اور فرنیچر سے محروم ہے۔

لیکن اصل ستم یہ ہے کہ ان پاکستان چلانے والوں کو نہ اپنی قومی ضروریات کا احساس رہا ہے نہ دینی ضروریات کا۔ حال ہی میں پنجاب میں پرائمری سطح سے انگریزی کی لازمی تعلیم کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ احمقانہ فیصلہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس پر کروڑوں روپے خرچ ہوں گے۔ لاکھوں طلبہ میں سے جو پرائمری میں ہیں' ایک بہت قلیل تعداد ہے جو میٹرک تک پہنچ پائے گی۔ پھر میٹرک' انٹر اور بی اے' ہر سطح پر تقریباً ۶۰ فی صد تعداد امتحانات میں ناکام ہو کر باہر رہ جائے گی۔ بی اے اور ایم اے میں جہاں انگریزی جاننا ضروری سمجھا جا سکتا ہے' چند ہزار سے زائد طلبہ کی تعداد باقی نہ بچے گی۔ پھر یہ زرِ کثیر کا ضیاع اور اس سے بڑھ کر انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کا ضیاع کس لیے۔ انگریزی کی تعلیم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں' لیکن اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والوں کے لیے اس کے خصوصی انتظامات کیے جا سکتے تھے۔

دفترِ خارجہ اور بیرونی ممالک میں ہمارے سفرا جس طرح وہاں اپنے لیے دوست پیدا کرنے میں' اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے میں' اس کا قائل کرنے میں' ہماری تجارت کو فروغ دینے میں' اور اپنے عیش و عشرت سے کچھ وقت بچا کر پاکستانیوں کی خبر گیری کرنے میں' بُری طرح ناکام ہیں' وہ محتاجِ ثبوت نہیں۔ کشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر اپنی قرارداد واپس لینے کی جو دلدوز خبر آج ہی آئی ہے' وہ صرف اسی سفارتی نااہلی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چین' ایران اور سوڈان جیسے ممالک کو بھی اپنا ہم نوا نہ بنا سکے' یا پہلے سے ان کے نقطۂ نظر سے آگاہ نہ ہو سکے' تو سر پیٹنے کا مقام ہے۔ سوڈان کے دفترِ خارجہ کے ذمہ دار کے الفاظ میں: ایک سیکنڈ سیکرٹری ضرور آیا تھا' ہم نے تو اب تک قرارداد کا مسودہ بھی نہیں دیکھا۔ پھر تو قرارداد کا حشر یہی ہونا تھا۔

یہ منظرنامہ سیاسی عدم استحکام سے زیادہ تشویش ناک اور دل خراش ہے۔ اگر سیاسی استحکام نصیب بھی ہو جائے' لیکن ملک کو چلانے کے انداز و اطوار یہی رہیں' تو اس استحکام سے بھی کیا حاصل ہو گا۔ اس وقت تو ہر دردمند پاکستان کو اسی مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہیے اور اس حل کے لیے جو کچھ کر سکتا ہو وہ کرنے کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔

اصل مسئلہ نظام کا نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انتخابات اور مغربی جمہوریت سارے فساد کی جڑ ہیں' لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان کا وہ متبادل کیا ہے جس کے ذریعے حکمرانوں کا عزل و نصب عام مسلمانوں کی رائے اور مشورے سے ہو سکے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سسٹم میں بندوں کو گنا جاتا ہے' تولا نہیں جاتا۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اگر بندوں کو تولنے کا کوئی نظام وضع کیا

جائے تو تولنے کے باٹ کیا ہوں گے' ان باٹوں کو کون بنائے گا' ترازو کا پلڑا کس کے ہاتھ میں ہو گا' اور یہ سب کام کرنے والے لوگوں کا تعین کون کرے گا' اور کیسے کرے گا۔ کیا ترازو پر تولنے والے لوگ خود بخود ظہور پذیر ہو جائیں گے' یا خود اپنے کو اس مقام پر فائز کر لیں گے۔ پھر اگر وہ غلط باٹ بنائیں' اور تولتے ہوئے ڈنڈی مارنے لگیں' تو اس کا علاج کون کرے گا' اور کیسے کرے گا۔ بعض لوگوں کے نزدیک بس پارلیمنٹری نظام کو صدارتی نظام سے بدلنے کی ضرورت ہے اور سارے امراض کا مداوا ہو جائے گا۔ لیکن اس ملک کی زندگی اکثر و بیشتر تو انتخابات کے ذریعے منتخب پارلیمنٹری حکومتوں کے تحت نہیں گزری ہے' بلکہ ایسے افراد کے تحت گزری ہے جو دستوری صدر سے بھی زیادہ بااختیار تھے' اور جنھوں نے باٹ بنانے اور تولنے کے منصب پر بھی خود ہی اپنے کو فائز کر لیا تھا۔ لیکن وہ تو خود اپنا استحکام یقینی نہ بنا سکے' ملک کو مستحکم کیسے بناتے۔

بعض لوگ مسلسل سیاسی لیڈروں کو وعظ و نصیحت کر رہے ہیں' ان کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ وعظ و نصیحت اچھی چیز ہے' اسے جاری ہی رہنا چاہیے' کہ شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے۔ لیکن مسلسل تجربہ بتا رہا ہے کہ کوئی گروہ بھی سبق سیکھنے کو تیار نہیں' نہ اپنے انجام سے' نہ اپنے پیش رووں کے انجام سے۔ ان پر قرآن کی یہ آیت صادق آتی ہے:

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ (طہ ۲۰: ۱۲۸)

پھر کیا ان لوگوں کو (تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟

اصل مسئلہ انسان کا ہے۔ جس انسان کے دل کو ہوائے نفس گھن کی طرح چاٹ گئی ہو' اور جسے حُبِّ دنیا کا کینسر لاحق ہو' وہ ہر نظام کو تباہی سے دوچار کر دے گا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم میں جو افراد بھی ذاتی مفاد سے بالاتر اس ملک کو صحیح راستہ پر لے جانے کے آرزومند ہیں' وہ وعظ و نصیحت سے آگے بڑھیں اور ملک و قوم کو بچانے کے لیے عمل کے میدان میں اتریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اب بھی اس ملک میں ایسے لوگوں کی ایک کثیر اور وسیع تعداد موجود ہے۔ لیکن وہ بکھری ہوئی اینٹوں کی طرح ہیں۔ وہ کسی تعمیرِ نو کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ یہی سب لوگ اگر مجتمع ہو جائیں' ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جائیں' تو وہ ایک بہت بڑی سیاسی قوت بن سکتے ہیں۔ وہ تمام اہم اور غیر اہم اختلافات کے باوجود ایک جامع قومی اور دینی پروگرام پر جمع ہو سکتے ہیں۔